کے لئے تیرتی ہوئی اس کی قربت میں آنکلی اور پھر سناٹے نے اسے نگل کر اجل میں دھکیل دیا..

کل سویرا اُسے کہاں واپس جانا تھا؟..

آنکھیں جھپکاتا خاور سامنے دیکھتا رہا.. ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی..

سائیں سندھ اندھیرے کی اجرک میں لپٹا کروٹیں لے رہا تھا..

اور وہاں روشنی تھی..

کائنات کے آغاز میں یہی کروٹیں بدلتے اندھیرے تھے اور ان پر پانیوں کی روح تیرتی تھی جب اذن ہوا کہ روشنی ہو جا.. اور وہاں روشنی تھی..

وہی چادر جو ابھی تاریکیوں میں پوشیدہ تھی ابھی اس پر روشنی بچھنے لگی.. وہ جگمگانے لگی.. اس پر ستارے اترنے لگے.. دائیں جانب سے انڈس کوئین ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح.. جو ہر شب ایک خاص وقت پر سٹیج پر داخل ہوتی ہے.. وہ نمودار ہو رہی تھی۔

عرشے پر رسّوں سے بندھے بلب جھولتے تھے..

اس پر ایک دنیا آباد تھی..

مسافر خوش گپیوں میں مصروف تھے..

ان کے چہرے اور ان کے لبادے پہچانے نہ جاتے تھے کہ وہ گئے وقتوں کے تھے۔

راج کے رکھوالے سفید فام... گورا لوگ اور ان کے غلاموں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی شاہانہ وردیاں.. پر پیچ موم سے اکڑی مونچھیں جو ہر صاحب یا میم صاحب کو دیکھتے ہی پگھل کر ڈھیلی ہوتی گر جاتی تھیں اور وہ انہی کے تناسب سے صاحب بہادر کے سامنے گرتے اور جھکتے چلے جاتے تھے..

کوئی سولا ہیٹ اور خاکی وردی میں ملبوس بظاہر آوارہ گرد سیاح جو بلوچ وحشیوں کی سرزمین کو پہلی بار دریافت کرنے کے لئے آیا تھا اور اپنے سفر کے نقشے اس اہتمام سے بناتا تھا کہ برطانوی راج کو بہ وقت ضرورت تہذیب پھیلانے کے لئے مددگار ثابت ہوں.. اور سرکشی اختیار کرنے والے بلوچوں کو مطیع کرنا آسان ہو..

ایک سفید روسی پوڈل.. کیوٹ اینڈ کڈلی... حیران اور پریشان.. اپنی سفید فام مالکن سے بچھڑا ہوا.. ہجوم سے ہراساں.. عرشے کے ایک کھمبے کے قریب ہو کر ٹانگ اٹھائے اپنے آپ کو ہلکا کرنے میں مصروف.. اور متعدد معززین اسے دیکھ کر لاڈ سے مسکراتے ہوئے اپنی اچکنوں کی بالائی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اور ان میں سجے ریشمی رومالوں کو کھینچ نکالنے کی آرزو میں.. تاکہ خوشنودی کے لئے ان سے عرشے کو پونچھا جا سکے..

لیکن ان سب سے الگ تھلگ..

عرشے کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے.. اپنے سامنے تاریکی میں گھورتی.. اس ٹیلے کی جانب بے نور آنکھوں سے تکتی.. کچھ شکلیں تھیں..

وہ ہر لمحہ بدلتی تھیں.. تغیر سے دوچار ہوتی تھیں.. کبھی وہ عابدہ سومرو تھی جو اسے پہچانتی نہ تھی.. اور کبھی غلافی آنکھیں تھیں جو خاک ہوتی تھیں..

انڈس کوئین.. اس کے سامنے ایک رواں منظر کی طرح... سندھ سائیں کے تاریک سینے پر روشنیاں بکھیرتی 'تیرتی 'گزرتی جاتی تھی.. اور پھر اس گزرن میں کوئی ایک لمحہ ایسے رکا کہ وہ ٹھہر گئی.. وہیں ایک ہی مقام پر ساکت اور سناٹے میں آکر جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی...

اس کے عرشے پر جو رونق تھی وہ اس کے ٹھہرنے سے ماند نہ ہوئی.. جاری رہی.. کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ وہ سکوت میں چلی گئی ہے.. روانی تھم گئی ہے۔

جیسے اس نے اپنے بھاری لنگر گرا دیئے ہوں..

خاور کے سامنے سندھ کی سیاہی میں اس کی روشنیاں ایک ہی مقام پر جگمگاتی رہیں.. رونق میں فرق نہ آیا..

خاور تادیر اس کی پھر سے روانی کا منتظر رہا.. ایک سٹل لائف پینٹنگ کی مانند اسے دیکھتا رہا جس میں جان نہیں ہوتی..

ذخیرے کے اندر پکھی اپنے پچھلے جنم کو لوٹ کر سروٹوں پر پرچھائیں ہوتی تھی..

وہ صدیوں سے اس ٹیلے پر براجمان اسے دیکھتا رہا اور انڈس کوئین وہیں کھڑی رہی.. اور پھر بغیر کسی اطلاع کے... کسی تشخیص کے بغیر اس کا رکا ہوا وجود نہایت دھیرج سے پانیوں

میں ڈوبنے لگا.. بے جواز... بغیر کسی وجہ کے... کسی برفانی تودے سے ٹکرانے کے بغیر.. وہ آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا.. ڈوبنے لگا..

لیکن عرشے پر کھڑے اور ٹہلتے ہوئے لوگوں کے چہروں پر کوئی تبدیلی ظہور پذیر نہ ہوئی.. وہ جیسے آگاہ ہی نہیں تھے کہ انڈس کوئین اتنی دیر تک اگر ایک ہی مقام پر رکی رہی ہے تو کیوں.. اور اگر اب آہستگی سے ایک بھاری پتھر کی طرح نیچے جا رہی ہے تو کیوں... وہ مشغول تھے اور آگاہ ہی نہیں تھے..

وہ سب اسی طور اپنی اپنی حالتوں اور کیفیتوں میں برقرار رہے اور انڈس کوئین کے عرشے تک پانی آ گئے.. اوپر ہوتے گئے.. ان کے لمبے کوٹ پانی کے ابھرنے سے اٹھتے.. ان کی نیک ٹائز تک پانی آتا تو وہ سطح آب پر چیتھڑوں کی طرح تیرنے لگتیں...

بڑے گھیرے والی بلوچ شلواریں پانی سے بھر کر پھولنے لگیں.. سرداروں کی مونچھوں کے بل کھلنے لگے.. بھاری پگڑیوں پر پانی کی روانی غالب آنے لگی لیکن اس کے باوجود انہیں احساس نہ ہوا کہ ہم ڈوب رہے ہیں..

سفید روسی پوڈل کب کا غائب ہو چکا تھا اس لئے کہ عرشے پر سندھ سائیں کی چادر بہنے لگی تھی..

یہاں تک کہ کموڈ پر اطمینان سے براجمان پھولدار بڑے ہیٹ اور گھٹنوں تک آتے پولکا ڈوٹ ڈریس میں ملبوس معزز لیڈی صاحبہ کو بھی فراغت کے ان لمحوں میں کچھ علم نہ ہوا کہ پانی ایک بے نام آہستگی سے کموڈ کو ڈبو کر اس کے چینی پر لز کے ہار تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ اسی اطمینان سے بیٹھی رہی جیسے ایک تصویر اتروا رہی ہو..

وہ سب... جو انڈس کوئین کے مسافر تھے.. پانی پر اٹھتے ایک بلبلے ایسی بے آواز کیفیت میں انڈس کوئین کے ساتھ نیچے ہوتے گئے..

سندھ کے تاریک پانیوں کے اوپر انڈس کوئین کی تدفین کا آخری نشان وہ بھونپو تھا جو ایک کھوکھلے ستون کی مانند سطح آب میں سے نکلا ہوا دکھائی دیا.. کچھ دیر اس کی آنکھوں کے سامنے رہا اور پھر وہ بھی پانیوں میں چلا گیا..

سندھ سائیں کی چادر پھر سے اپنی آبائی تاریکی میں چلی گئی..

وہ جس مقام پر رکی تھی.. انڈس کوئین جہاں پانیوں میں آہستگی سے تحلیل ہوئی

تھی.. وہاں اس کے وجود کے کوئی آثار باقی نہ تھے.. جیسے ایک ڈولفن.. دھیرے سے نیچے چلی گئی ہو.. نہ سطح آب پر کوئی تلاطم ہو.. نہ بلبلے ابھرتے ہوں... پانیوں کی وہی تاریک ہموار گی اور روانی ہو جو اس کے منظر میں جگمگاتے ہوئے داخل ہونے سے پہلے تھی..

اور اس لمحے... گھنی گھاس اور سرکنڈوں کے ذخیرے کے اندر سے.. جہاں فہیم جھومر ڈالتا تھا.. پکھی کا دراوڑی بدن سروٹوں پر اپنی پرچھائیاں ڈالتا پچھلے جنموں کو لوٹتا تھا اور ماماں جعفر کے اندر یوئی مشک مچاتی تھی وہاں.. ایک مور بولا... میں آؤں... میں آؤں...

"موت... مجھے تمہارے قریب لے آئی ہے.. ڈیتھ!"

کسی بھی موت کا ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے.. عمر رسیدہ... کچی... ناگہانی... حادثاتی... بے وجہ... کسی بھی موت کا.. زمین کی پہلی موت پر جب کوّے اترے تھے چونچ سے مٹی کھود کر تدفین کی بھارت سلجھاتے تھے.. تب سے اب تک لمحۂ موجود کی آخری موت تک... وہی ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے..

بُو ہوتی ہے...

اور بُو کے سوا بین ہوتے ہیں...

اور بُو بتاتی ہے کہ چارپائی پر سفید چادر کے نیچے جو شخص ہے اس نے آخری ہچکی کب لی تھی.. اور اس کے تلوؤں سے فنا کی جو ٹھنڈک شروع ہوئی تھی وہ اس کے بدن کو مردہ کرتی کب اس کی آنکھوں تک پہنچی تھی اور انہیں بے جان ڈھلکا ہوا شیشہ کر دیا تھا..

عمر رسیدہ موت متوقع ہوتی ہے اور اس کا ردعمل میکانکی ہوتا ہے..

کچی موت میں ہمدردی بہت ہوتی ہے اس تشکر کے ساتھ کہ وہ ان کے گھر نہیں آگئی..

یقین سے ماورا ہو جانے والی موت حادثاتی ہوتی ہے..

اور بے وجہ موت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی..

لیکن ہر مقام پر چار دیواری کے اندر اس کی بُو ضرور موجود ہوتی ہے..

وہ شخص جو سفید چادر تلے عامل معمول ایسے کھیل کی طرح لیٹا ہوتا ہے وہ دم بخود ہوتا ہے اور یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے یا نہیں.. صرف بُو بتاتی ہے۔

اس چادر کا ایک کونہ اٹھا کر اسے دیکھا جائے تو اس کا چہرہ زرد پھٹکری ہوگا.. اور اس پر ایک عجیب حماقت آمیز تاثر ہوگا' منہ کھلا ہوا.. رگیں ڈھیلی اور ٹھنڈی ہو چکی ہوئیں

اور کھلے منہ کے اندر تالو اور مسوڑھے زردی کی کھنڈت میں..

صرف دو مواقع پر انسان اپنے اختیار سے باہر ہو کر بے بس ہو جاتا ہے اور حماقت کے قریب چلا جاتا ہے.. ایک نسل بڑھانے کے آخری لمحوں میں یا پھر موت کے بعد..

موت بھی چونکہ اختیار سے باہر ہوتی ہے اس لئے اس میں بے اختیاری ہوتی ہے..

اگر یہ کھلی فضاؤں میں آئے.. کسی برفانی دراڑ میں گر کر.. مرنے کے بعد رسوائی کے ڈر سے غرق دریا ہو کر آئے.. صحرا میں پیاس سے بدن خشک ہو جائے.. یا پھر پانیوں کی چادر میں ڈولتی ایک کشتی کے اندر آ جائے تو بھی وہاں بُو ہوتی ہے.. لیکن وہاں اس کا شک نہیں ہوتا.. کہ یہ اکیلی نہیں ہوتی۔ یہ پانیوں کے دھیرے دھیرے خشک ہونے کی.. بستیوں کے برباد ہونے کی.. ان پرندوں کی جو شکاریوں کے چھروں سے زخمی ہو کر پانیوں اور ٹاپوؤں پر گر کر پھڑپھڑاتے رہے اور پھر جان ہار گئے ان کے مردہ پروں اور سڑتے گوشت کی.. مردہ مچھلیوں اور ٹھہرے ہوئے پانیوں کی بُو بھی ہو سکتی ہے.. اسی لئے صرف مرگ کی مہک ان سے الگ پہچانی نہیں جا سکتی.. اگرچہ وہ وہاں ہوتی ہے..

فہیم سروٹوں 'سرکنڈوں 'کاہاں 'سر 'کوندرے 'لائی اور لہنا کے بُوٹوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا... اور سروٹوں پر اب پچھلے جنم کے سائے جھومر نہ ڈالتے تھے.. اب وہاں سویرے کی دھند میں گھلی ہلکی دھوپ تھی... وہ ملاحا... حا... ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار ونجناں... گنگناتا.. آخری ناشتے 'آخری پراٹھے اور غروب کی زردی والے دیسی انڈوں کی زردی سنبھالتا اترتا ہے.. سروٹوں کے گھنے وجود میں سے نکل کر ریتلے کنارے پر اترتا ہے.. اور ریت پر اوس کی ٹھنڈک اور جماؤ ہے جس پر پاؤں رکھتا وہ سندھ سائیں کے پانیوں میں ٹھہرتی کشتی کی جانب چلتا جاتا ہے.. اور اپنے گھر واپسی کی مسرت میں دمکتا گنگناتا آتا ہے اور آج پانی کی قید کا آخری دن تھا.. آخری ناشتہ تھا..

صاحب رات کشتی میں ہی رہ گیا تھا..

ان سے جدا ہو کر ادھر آیا تھا اور ادھر ہی رہ گیا تھا..

سویرے ناشتے کے لئے وہ سروٹوں کے ذخیرے کے درمیان پوشیدہ اس آخری پڑاؤ میں واپس نہیں آیا تھا جہاں پچھلے شب آگ کی سرخ توانائی کی بھڑکتی لپکتی اور پھر ٹھنڈی ہوتی

زبانوں کے گرد وہ تینوں جھومر ڈالتے تھے.. اسی لئے وہ صاحب کا ناشتہ لے کر ادھر آ رہا تھا..

ابھی ہلکی دھند تھی جو سندھ کے پانیوں پر تیرتی تھی..

جیسے تخلیق کے پہلے دن تیرتی تھی.. لیکن ابھی یہ حکم نہیں اترا تھا کہ روشنی ہو جا.. صرف طلوع کا مٹیالا سونا تھا جو سندھ سائیں کی آبی چادر پر بچھا ہوا دکھائی دیتا تھا جس کے کنارے وہ کشتی فہیم کے آخری ناشتے کے قریب آتی جاتی تھی جس کے اندر صاحب ابھی تک سوتا تھا..

کشتی کے تختوں پر جو گل بوٹے نقش تھے وہ بھی ہلکی دھند میں دھندلاتے تھے پر آہستہ آہستہ قربت میں آنے پر دکھائی دیتے جاتے تھے..

فہیم نے چھابے میں دھرے پراٹھے کو اپنی پوروں سے چھوا.. ابھی تک گرم تھا.. انڈے کی زردی میں بھی ایک نامعلوم سی حدت قائم تھی اور پھر اس نے اپنا گنگنانا موقوف کر کے کشتی کے اندر جھانکا..

"ناشتہ کریں گے سائیں.."

سائیں.. اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے... بے سُدھ پڑا تھا..

سندھ ساگر کی اس سویر میں... انڈس کوئین کو غازی گھاٹ کے پانیوں سے دور ہوئے... بیکار زنگ آلود جنگ میں بدلے.. کھیتوں کی سبز روئیدگی میں خشک اور بے بس پڑے.. زنگ کے ذروں میں روپوش ہوئے.. سٹیئرنگ وہیل کے نیچے گنے کے پھوک... ایک مردہ لائف جیکٹ... عرشے پر برہنہ حالت میں ایک کموڈ... صوفوں میں سے نکلتے بگولا سپرنگ... دھجیوں میں بکھرا بے رنگ قالین.. شکستہ اور کھنڈر ہوئے انڈس کوئین کو جب مدتیں گزر چکی تھیں اور وہ کسی دیوانے کے خواب میں ہی دوبارہ سندھ کے پانیوں پر رواں ہو سکتی تھی... وہی خواب جس میں پوا جی کا لکڑی کا جہاز اڑتا تھا اور ان کی سفید لٹیں ایک عیسٰے کی مانند ان کے ریشمی کندھوں پر لہراتی تھیں..

جب ایک سرخاب کے پَر پاؤں کی دھمک سے فضا میں بلند ہوتے تھے اور ہر پَر ایک سرخاب میں بدلتا تھا..

اپنی پیاری جان کے بچاؤ کے لئے جب ایک جل مرغی پانی میں بار بار ڈبکی لگاتی تھی اور اجل کی ڈور اس کے پنجے سے بندھی اسے کھینچتی تھی کہ اس ڈور کے آخری سرے پر

شاہ حسین نہ تھا جو لک چھپ لک چھپ ڈور کھینچتا تھا بلکہ موناں بدھا عطا اللہ اپنے تہبند کو سنبھالتا اسے بھونے کو کھینچتا تھا۔۔

ہنسوں کی چراگاہ کے آسمان پر ان کی ڈاروں کو پلٹتے۔۔ شور مچاتے۔۔

سندھ کے کناروں پر پانی پینے کے لئے آنے والے مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی سمفنی بلند ہو کر اسے ایک آبی مندر میں بدلتے۔۔ ٹن ٹن ٹن

اور اندھی ڈولفنوں کی پشتوں پر ہومر کی سوریوں کی حنائی انگلیوں کے اترنے کے بعد۔۔۔ مدتیں بیت چکی تھیں۔۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا جب فہیم نے کشتی میں جھانک کر کہا تھا۔

"ناشتہ کریں گے سائیں"

سائیں جاگتا نہ تھا۔۔ اور فہیم نے دوبارہ پکارا۔

"ناشتہ کر لیں سائیں۔۔ باہر آ کر منظر کشی کر لیں پھر۔۔۔ آج تو گھر بار کو لوٹنا ہے"

لیکن سائیں۔۔ اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے۔۔۔ بے سدھ پڑا تھا۔۔ اور جاگتا نہ تھا۔۔

کھنڈر میں۔۔۔ ملبے کے اندر۔۔۔ بارہ کہو کے مسمار شدہ بل ڈوزر کے دانتوں سے کچلے ہوئے بام و در کی تہہ میں۔۔ دبے ہوئے ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی چلی جاتی تھی۔

چونکہ خاور ایک ہتھیار ڈال دینے والے سپاہی کی مانند ہاتھ کھڑے کر کے۔۔ احتجاج کئے بغیر۔۔ درخواست گزار ہونے اور اپنی محرومی اور ناانصافی کا چرچا کئے بغیر ایک بیگ اٹھا کر چپکے سے رخصت ہو گیا تھا اس لئے اس کا گھر۔۔۔ بلکہ اس کی اینٹیں۔۔ کچھ دیواریں۔۔ ملبے کے ٹیلے آس پاس کے گاؤں کے مکینوں اور ان کے بچوں کے لئے ایک خزانے کی تلاش بن چکے تھے۔۔ وہاں کھوج کرنے سے اور کھودنے سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔۔ شکستہ صوفے اور میزیں۔۔ کچن کا سنک۔۔ کموڈ اور پانی کی ٹونٹیاں۔۔ دب چکے قالین۔۔ ایش ٹرے۔۔ دروازے۔۔ کھڑکیاں۔۔ الارم کلاک۔۔ پردے۔۔ ایک نیلا سویٹر۔۔ غرض کہ وہ ہر شے جو کسی بھی گھر میں ہوتی ہے اور ہر گھر میں سج سکتی ہے اس ملبے میں سے دریافت کی جا سکتی تھی۔۔ اور وہاں کوئی والی وارث نہ تھا جو اس کی رکھوالی کرتا۔۔ اس لئے آس پاس کے لوگوں نے کھود کھود کر اس خزانے کو دریافت کیا اور اپنے گھروں کو لے گئے۔ صرف ملبے کے اندر دفن ٹیلی فون کی گھنٹی

مسلسل بجتی چلی جاتی تھی کیونکہ اس کی تار بل ڈوزر کے دانتوں میں آ کر کٹنے سے بچ گئی تھی..

ایک بچے نے کھنڈر کی خاموشی میں کان لگا کر سنا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے... اس کے دونوں ہاتھ فارغ نہیں تھے.. ایک میں وہ وادی کالاش کا ایک چوبی گھوڑا تھامے ہوئے تھا جو بالکل محفوظ تھا اور دوسرے ہاتھ میں مٹی سے بھرا ایک پرانا الارم کلاک تھا جس کی سوئیاں ابھی تک درست ہندسوں پر تھیں اور وہ ٹک ٹک کر رہا تھا.. دوسرے بچے خزانے کی تلاش میں ملبے کو کھود رہے تھے لیکن اسے ایک آواز سنائی دے رہی تھی.. اس نے چوبی گھوڑے اور الارم کلاک کو ایک نیلے اور مٹی سے آلودہ چیتھڑا نما سویٹر کے قریب رکھا.. کان لگا کر غور سے سنا.. پھر کچھ اینٹیں ہٹائیں جن کے نیچے خاک بسر ٹیلی فون دبا پڑا تھا اور اس کی گھنٹی کی آواز اینٹوں کے اٹھانے سے بلند ہو گئی تھی.. اور اس کے چونگے کو اٹھا کر... جیسے وہ ایک پلاسٹک کا بنا ہوا کھلونا ٹیلی فون ہو.. بچے نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"ہیلو جی... کون ہے؟"

"خاور... کیا یہ آپ ہیں..؟"

"ہاں جی..." بچے کی خزانے کی تلاش میں یہ کوئی آواز تھی جسے وہ نہیں سمجھتا تھا... اور ہنستا جاتا تھا..

"میں کولمبو سے بات کر رہی ہوں.. سلطانہ..."

"ہاں جی..." بچے نے پھر کہا اور زور سے سر ہلایا کہ یہ تو زبردست کھیل تھا..

"یو ساؤنڈ سٹرینج... لیکن میں پرسوں صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ رہی ہوں... تمہیں... آپ کو وہاں ہونا چاہئے... کیا... تم وہاں ہو گے؟"

بچے نے اپنے ننگے بازو پر اپنی ناک رگڑ کر اسے پونچھا اور پھر ریسیور کی تار کھینچ کر اس ٹیلی فون کو بھی چوبی گھوڑے اور الارم کلاک کے ساتھ اپنے خزانے میں شامل کر لیا..

سائیں جاگتا نہ تھا اور فہیم آوازیں دیتا تھا.. کشتی کے اندر جھانکتا ہوا کہ.. صاحب ناشتہ تیار ہے.. صاحب منہ کھولے اپنے سلیپنگ بیگ میں بے سدھ پڑا تھا..